درندہ
پیغام آفاقی

درنده

درندہ

[شاعری]

پیغام آفاقی

اسکان انٹرنیشنل دہلی

DARINDA
(Poetry)
Paigham Afaqui

First Edition 2001
ISBN. 81-7886-000-7
Price Rs. 200
© مصنف

کتاب	درندہ (شاعری)
شاعر	پیغام آفاقی
	Flat No.1, Police Station Rajouri Garden New Delhi-110027
مرتب	شعیب رضا
سرورق	اعجاز الرحمن
ڈیزائن	عثمان علی
تعداد	2000
طباعت	جے۔کے۔آفسیٹ پریس، گلی گڑھیا، جامع مسجد، دہلی۔6

ملنے کے پتے

Modren Publishing House, Gola Market, Darya Ganj N.D-2
Educational Publishing House, Lal Kuan, Delhi-6
Maktaba Jamia, Ltd. Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-6
Anjuman Taraqqi-E- Urdu, Rouse Avenue, New Delhi-1
Book Emporium, Sabzi Bagh, Patna-4
Danish Book Depot, Aminabad, Lucknow
Maktaba Jamia Ltd. Prince Building, Mumbai, 400003
Educational Book House, Shamsad Mkt. Aligarh, U.P.
Usmania Book Depot, Lower Chitpur Road, Kolkata (W.B.)

IMKAN INTERNATIONAL

C-5-S, Delhi Police Apartment, Mayur Vihar, Phase-I
Delhi-110091 Ph.2252177

اپنے

ابّاً

شیخ عبدالجبار فاروقی مرحوم

کے نام

شعاعِ حق کی گرانی کبھی نہیں ہوتی
یہ شئے ہے وہ کہ پرانی کبھی نہیں ہوتی

شاعر کا پسِ منظر

اُس رہوا کا ریہو چھوٹا' اس کرسی کا دھان
چمپا پور[1] کی بستی چھوٹی قدرت[2] پھانکے پسان

---

[1] موجودہ بستی چانپ ضلع سیوان، بہار جو شاعر کی جائے پیدائش ہے۔
[2] شاعر کے خاندان کے ایک بزرگ قدرت حسین فاروقی جو انگریزی حکومت کے جبر سے وطن چھوڑ کر نیپال میں مقیم ہو گئے تھے۔

ترتیب

حصہ اوّل

حصہ دوم

حصّہ سوم

ایک عہد ساز ناول نگار کی شاعری

پیغام آفاقی ایک عہد ساز ادیب اِن معنوں میں ہیں کہ انھوں نے جدیدیت کے ذریعے درآمد کی گئی اُس یاسیت پرستی کو اپنے ناول کے ذریعے مسمار کیا جس یاسیت پرستی نے اُردو والوں کی ایک پوری نسل کو خوف زدہ اور نکما بنا کر رکھ دیا تھا۔ ناول ''مکان'' کے شائع ہونے سے پہلے اُردو ناول یا تو وقت کے سامنے انسان کو دریا میں بہتا ہوا ایک تنکا ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یا پھر اُن بھگیڑوؤں کی کہانی بیان کر رہا تھا جو تقسیم ملک کے وقت خوف یا لالچ کی وجہ سے اپنی وفاداری بدل چکے تھے۔ ناک پر بیٹھی مکھی کو بھلا کر جو فلسفی زندگی کے اسرار پر غور کر رہا ہو اُس فلسفی کے ویژن پر کتنا بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ یہ اُردو ناول کی بدقسمتی تھی کہ اس نے آزادی کے بعد بھی کئی دہوں تک ہندوستان کی زندگی میں پیدا ہونے والی اندرونی کشمکش، نئے سماج میں جینے کی حکمتِ عملی اور یہاں پنپنے والی سیاسی اور معاشی جرائم کے ارتقا سے اپنے کو دور رکھا تھا۔ آٹھویں دہے میں آنے والے ناول ''مکان'' نے یکسر اس صورتِ حال کو بدل دیا اور اُردو دنیا نے اسے ایک قومی ضرورت سمجھ کر سینے سے لگا لیا۔

ادب کا کسی قوم پر کتنا گہرا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ اُردو ادب کے اوپر پیغام آفاقی کے ناول **مکان** کے طلوع ہونے کے پہلے کی نسل اور اُس کے بعد کی نسل کے زندگی کے تئیں بدلتے ہوئے رویے سے لگایا جا سکتا ہے۔

اِس طرح کے ناول کے اثر کو سمجھنے کے لیے روسو، والٹیر اور مارکس کی اُن کتابوں پر نظر ڈالنی چاہئے جو ادب کی تاریخ کا حصہ بننے کے بجائے تاریخ کا حصہ بنتی ہیں۔

دراصل پیغام آفاقی اِس یاسیت اور اُس کے پسِ پردہ حقیقت کا ادراک اپنے بچپن سے ہی کر رہے تھے۔ اس کے شواہد اُن کی اِس شاعری میں موجود ہیں جو ''**درندہ**'' کے نام سے شائع کی جا رہی ہے۔

پیشِ نظر مجموعہ ''**درندہ**'' میں درندگی ایک ایسی حقیقت کے طور پر موجود ہے جس کا شاعر نے بنیادی طور پر ہر نظم میں اِدراک کیا ہے۔ یہ کہیں شیطان بن کر سطحِ زندگی پر اُبھرتا ہے تو کہیں زمانے کے آئینے میں نظر آتا ہے۔ اس مجموعے کی نظمیں درندہ، شیطان، بستی کے کنارے، وقت آنے سے اس قدر پہلے، شہر کے منارے سے، چیلنج، ایک باغی کا مرثیہ اور کھوئی ہوئی نیند اردو شاعری کے اُفق پر ایک نیا سماں باندھتی ہوئی شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہیں۔

پرواز کرو ہر پرِ پرواز سے آگے
رکھنا ہے قدم وقت کی آواز سے آگے

یہ شاعری جس طرح فرد اور اس کی سیاسی صورت حال کے رشتے کو بے دریغ کھول کر بیان کرتی ہے۔ اس سے ادب کے سیاسی رول کی اہمیت پوری قوت سے اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

جہاں پوری زندگی ٹوٹ پھوٹ جائے وہاں بھی ادب عوام کا سہارا بنتا ہے۔

پیغام آفاقی کی شاعری کو پڑھتے ہوئے میرا ذہن جس طرح متاثر ہوا وہ اپنے آپ میں ایک تخلیقی عمل کی طرح تھا اور اسی لیے میں نے ہر باب کے عنوان کے ساتھ اپنے تاثرات کو درج کیا ہے۔

شعیب رضا
۵/جولائی ۲۰۰۱ء

پیغام آفاقی
کے خط سے ماخوذ

آپ کو میری تازہ تخلیقات پڑھنے کا شوق ہے تو دیکھئے۔ یہ تحریر وتخلیق بھی اسی کی ہے جس نے کھیت کی واپسی، لوہے کا جانور، ٹرین، تلاش، ناریل کے پیڑ، سفید خوف، صفر، بلندی اور ایک آدھ ناولٹ لکھا۔ اس تحریر کو پڑھوانے سے پہلے ''خطوط'' کا لکھا جانا ضروری تھا۔ اِس تخلیق میں میں نے پہلی بار ''کچھ کہنے کی'' جرات کی ہے۔ پہلی بار لکھنے کی آزادی کا پورا استعمال کیا ہے۔

اِس تخلیق کو جو پڑھے اور اپنی رائے دے اس کا میں ممنون ہوں گا کیونکہ یہ میری آنے والی تخلیقات کا پیش خیمہ ہے۔ کھڑکی اور ٹرین کے بعد پاگل ہاتھی میرے لیے تیسری فکری علامت بنتا

جارہا ہے۔ مجھے شاید اس کے بارے میں کبھی کچھ لکھنا پڑے گا۔ آج کا انسان، قریب قریب پہلے کے انسانوں کی طرح ہاتھیوں پر سواری کر رہا ہے۔

میں Pessimist نہیں ہوں۔ پہاڑی پر چڑھنے والا کبھی تھک کر بیٹھ جاتا ہے تو ایک لمبی سانس لیتا ہے۔ یہ تخلیق اس لمبی سانس سے ابھرنے والی آواز ہے۔ میری زندگی کی محرک اور کوئی شئے نہیں، بس اتنا ہے کہ جب میں کروڑوں ہاتھوں کو خدا کی طرف اٹھے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرے دل میں ایک درد پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ایک شدید لاچارگی اور مجبوری کا احساس بھی۔

سنا ہے اُردو کلچر میں **میں** کا استعمال بُرا سمجھا جاتا ہے، لیکن میں کیا کروں، یہ میری مجبوری ہے۔ انسان اکثر ہم سے **میں** ہو جاتا ہے۔ اور اکثر لوگ **ہم** پہ خفا بھی ہو جاتے ہیں، مثلاً اگر کوئی کہے کہ ہم چور ہیں، جھوٹے ہیں، بزدل ہیں، تو اس سے بہتر ہے کہ وہ یہ کہے کہ **میں** چور ہوں، جھوٹا ہوں، بزدل ہوں اور خصوصاً جب سب لوگ مل کر کسی کو سولی پر چڑھا رہے ہوں تو وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہم سولی پر چڑھائے جا رہے ہیں۔ وہ تو یہی کہے گا کہ میں سولی پر چڑھایا جا رہا ہوں۔ اگر سب لوگ پورب کی سمت جا رہے ہوں اور ایک شخص اتر کی طرف جا رہا ہو تو وہ یہی تو کہے گا کہ **میں** اتر کی طرف جا رہا ہوں۔ کاش کہ میرا **میں** ہم میں تبدیل ہو جاتا لیکن یہ آسان تو نہیں۔ میری ساری جدوجہد اسی کی تو ہے کہ کسی انسان کو **میں** کا احساس نہ ہو۔ لیکن ہر شخص اپنے کو بہت ساری باتوں میں تنہا، بے سہارا پاتا ہے۔ میں جب بھی **ہم** لکھتا ہوں تو بے پناہ خوشی ہوتی ہے لیکن یہ موقع جلد نہیں ملتا اور کبھی کبھی

ہم وہاں پہ بیٹھے تھے
بعد میں ہوا معلوم
میں وہاں اکیلا تھا
بھوت میں نے دیکھے تھے
خوف سے میں لرزاں تھا
اور آج تک تب سے

دل مرا دھڑکتا ہے

جب بھی کوئی دیتا ہے دل کے پردے پہ دستک

مجھ کو ایسا لگتا ہے، یہ ہوا کا جھونکا تھا

ہم تو جانے والے تھے ایک ساتھ ہی لیکن

جب وہاں پہ پہنچے ہم

میں وہاں اکیلا تھا

دور دور تک کوئی، سایہ تک نہیں پایا

اک عجیب عالم تھا

اک عجیب دھوکا تھا

[1979]

درندہ
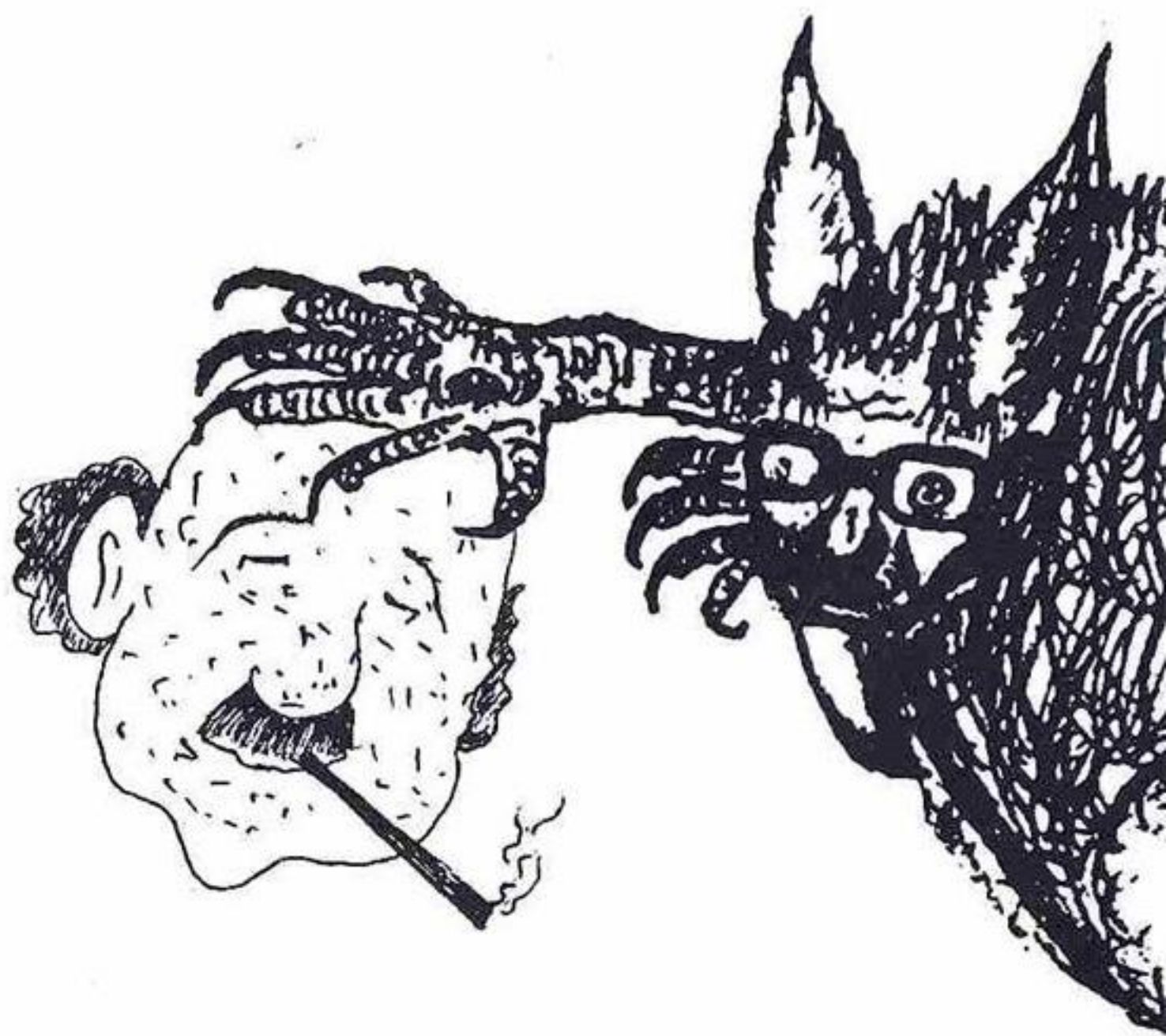
وہ دیکھو
آدمی خود آدمی کے واسطے کیا ہے

ہزاروں اجنبی چہرے
ہزاروں اجنبی گلیاں
ہزاروں اجنبی رستے
اگر انسان اس محفل میں تنہا، پاگل، آوارہ
پریشاں قہقہوں کے درمیاں
خود لڑ کھڑاتا ہے تو کیا ہے

یہ پر اسرار چہرے
دھند کے آویزاں پردے
اور ان پردوں کے پیچھے جانے کیا ہے

یقیں کی دھول
سر پہ بے یقینی کی تپش
پتھر کے آئینوں سے ٹکراتے ہوئے خوابوں کے لشکر
اگر اس شہر میں اک آدمی گھبرا کے مر جاتا ہے

تو کیا ہے
وہ دیکھو
آدمی خود آدمی کے واسطے کیا ہے

وہ دیکھو
ہاں، وہ دیکھو
آئینوں میں غور سے دیکھو
درندہ کوئی، بے فکری سے، منھ کھولے ہوئے
سنسان سڑکوں پر رواں ہے

وہ دیکھو
آدمی خود آدمی کے واسطے کیا ہے

حصّہ اوّل

پہلا باب

وہ دیکھو
آدمی خود آدمی کے واسطے کیا ہے

پتھر کے زمانے کا انسان پہاڑ کے غار میں یا اپنے اردگرد آگ جلا کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا تھا۔ اسے کس کا خوف تھا؟
اب نہ تو جنگل ہیں اور نہ ہی پہاڑ، پھر بھی لوہے اور سمینٹ کی مضبوط چہار دیواری کے پیچھے بیٹھا
انسان آخر کس کے خوف سے لرزاں رہتا ہے؟

سڑک پر لکھی ہوئی ایک غزل

یہ ابرِ حادثات کی بگڑتی بنتی چھاؤں ہے
یہ کھیتوں کے ندی کے بیچ ننھا شہر گاؤں ہے
طویل رات کی طرح یہ بھاگتی ہوئی سڑک
یہ کس کریہہ جانور کا سخت وسیاہ پاؤں ہے
افق کے پار بجلیوں کے کچھ دیئے چمکتے ہیں
عمارتیں ہیں جو وہاں یہاں تک ان کی چھاؤں ہے
ہے قسمتوں کا کیا ترازو آسماں کے ہاتھ میں
خوشی ہے شہر شہر، گاؤں گاؤں کاؤں کاؤں ہے
ہیں میری آنکھیں بند میں کھڑا ہوں بھیڑ کی طرح
ہے میرے آگے شہر اور میرے پیچھے گاؤں ہے
سیاہ خانۂ ستم میں آکے بند ہو گئے
ہیں راستے تمام بند صرف پاؤں پاؤں ہے

شیطان

ہاتھوں کی برکت
اور جسم کی حرکت
لے گیا کون چھین کر
شیطان............!

گرتے، پڑتے، جھکتے، مرتے، سسکتے
ہوئے انسانوں سے
جسے کوئی دلچسپی نہیں
پیار سے تسلی دیتا ہوا
کون ہے......شیطان

شیطان......!
کافی پیتا ہوا شیطان
سگار پیتا ہوا شیطان
خدا کے کمزور بندوں کی گردنوں پر

مضبوط بیٹھا ہوا

کتوں کی طرح جھبرے بالوں والا

ہاتھ میں قلم

زبان میں آگ

کینوس پر اپنی تصویریں تخلیق کرتا ہوا

اپنی باتیں بڑبڑاتا ہوا کون ہے؟

شیطان.........!

سانپوں کی طرح مضبوط

فلسفے کے دبیز زرہ بکتر میں ڈھکا ہوا

حقارت کے بھاری قدموں تلے

انسانوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح روندتا ہوا

کون ہے؟

شیطان.......!

یہ شیطان.........!

آسمان پہ شیطان، زمین پہ شیطان

ہوا میں شیطان، خلا میں شیطان

گمشدہ روایتیں

صاف وشفاف جھیلوں کی وہ مچھلیاں
وہ تڑپتی ہوئی مچھلیاں
خوبصورت تھیں
اور ایک دن وہ انہیں مار کر کھا گئے
صاف وشفاف جھیلوں میں اب خون کی دھار ہے

الفاظ کے تاریک بادل

الفاظ کے جادو سے

سحر کاروں نے ہر وقت

پتھر کو کبھی شیشہ

کبھی آگ کو شبنم

نفرت کو محبت، کبھی انسان کو حیوان.......... حیوان بنایا

جس راہ پہ چلتے رہے گمراہ مسافر

ان راہوں کو ہر موڑ پہ، بے موڑ پہ

اس طرح گھمایا

کہ جیسے خلاؤں میں سبھی گھوم رہے ہوں

دیوانوں کی مانند

گردش نے انہیں اور بھی

دیوانہ بنایا

دیوانوں کے قدموں میں یہ لٹکی ہوئی زنجیر الفاظ کی

اب چیخ رہی ہے

الفاظ پہ دیوانے بھروسہ نہیں کرتے

❖

ایک ننھے شاعر کا اندیشہ

خوشنما ہے یہ رنگ کاپی کا
اس کے اندر بہت سے پنّے ہیں
کچھ ورق اس کے سادے سادے ہیں
اس میں کُل ہیں قریب نوّے ورق
ان گنت ہیں خطوط متوازی
اس میں اک نظم میں نے لکھی ہے
نظم کا موضوع ایک فائرنگ ہے
مر گئے جس میں کتنے ہی معصوم
آدمی گولیوں سے ڈرنے لگا
آنکھ لبریز ہے اسی غم سے
اس کا ہر شعر خوں میں ڈوبا ہے
اس کو پڑھنا ہے ایک جلسے میں
جس میں آئیں گے حضرت زوّار[1]
دیکھنا ہو رہی ہے اب بارش
اس میں کاپی نہ بھیگ جائے کہیں

---

[1] بہار کے ایک سابق وزیر

اس میں پانی کے قطرے گرِ گرِ کر
اس کو برباد کر نہ ڈالیں کہیں
ہاتھ میں تم اسے اٹھالو ابھی
اور لے جا کے میز پر رکھ دو

1969

کڑی دھوپ سے پہاڑوں تک

مہرِ تاباں کی تیز کرنوں سے
ذرّہ ذرّہ ہے آتشیں پیکر
ہر طرف ایک ہولناک سماں
ہر طرف محوِ اضطراب انساں
راستوں پہ، ڈگر پہ، کھیتوں پہ
چھا گیا ہے بخار کا غلبہ
کچھ مویشی کھڑے لبِ دریا
پی کے آبِ حیات بیٹھ رہے
ہو کے پژمردہ سبزہ زاروں سے
چل رہی ہے ہوائے کیف آگیں
گا رہے ہیں عجیب سا نغمہ
چیڑ کے پیڑ کھوئے کھوئے سے
آرہی ہے تھکی تھکی سی صدا
سنگ ریزوں سے آبشاروں سے
اک سکوں آفریں شجر کے تلے
آ کے لیٹا ہوا ہوں گھاس پہ میں

جیسے لوری سنا رہا ہے کوئی
جیسے ہر غم سے پا چکا ہوں نجات
جیسے ہر فکر ساتھ چھوڑ چکی

پھر کسی نے اُٹھا دیا آ کر
اس جگہ سے بھگا دیا آ کر

یہ سکوں اور یہ پیار فطرت کا
اس زمانے کی یاد ہیں شاید
جب کہ انسان دستِ فطرت کا
خوبصورت سا اک کھلونا تھا
جیسے ماؤں کی گود میں بچّے

آج یہ چین یہ سکون کہاں
آج تو جنگلوں کے اندر بھی
شہر کے کاروبار چلتے ہیں
آج جنگل کی زندگی کے لیے
شہر سب سے بڑا درندہ ہے

دوسرا باب

ہزاروں اجنبی چہرے
ہزاروں اجنبی گلیاں
ہزاروں اجنبی رستے

کیا دہشت و بربریت سے اٹی پڑی دھرتی پر اگر ہمیں رہنا ہے تو اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے اس دھرتی کے نام نہاد ٹھیکیداروں سے راہ و رسم پیدا کرنی ہوگی ورنہ ہمیں اجنبیت کے گہرے غار میں قید کر دیا جائے گا؟

بھوت

ہم وہاں پہ بیٹھے تھے
بعد میں ہُوا معلوم
میں وہاں اکیلا تھا
بھوت میں نے دیکھے تھے
خوف سے میں لرزا تھا
اور آج تک تب سے دل مرا دھڑکتا ہے
جب بھی کوئی دیتا ہے دل کے پردے پر دستک
مجھ کو ایسا لگتا ہے یہ ہوا کا جھونکا تھا
ہم تو جانے والے تھے ایک ساتھ ہی لیکن
جب وہاں پہ پہنچے ہم، میں وہاں اکیلا تھا
دُور دُور تک کوئی سایہ تک نہیں پایا
اک عجیب عالم تھا
اک عجیب دھوکا تھا

کمرہ

یہ درودیوار، یہ کمرہ، یہ لمحے
اور میں
صرف میں
اور یہاں کوئی نہیں
کچھ بھی نہیں
میں کہاں ہوں؟
قبر میں لیٹا ہوں کیا؟

بے چہرہ انسان

رفتہ رفتہ، ہمیں اس طرح زندگی میں سجایا گیا
ہم چمکنے لگے، جگمگانے لگے

جوق در جوق
بے آنکھ، بے کان، بے چہرہ انساں
کہاں کون ہے کون جانے؟
مگر ہم سبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
کسی اجنبی دُھن کے
رقّاص ہیں

غزل

خواب تعبیر کے اسیر نہ تھے
رہ گزر تھے یہ راہ گیر نہ تھے

رہنما تھے کبھی وہ سچ ہے مگر
یہ بھی سچ ہے کہ میرے پیر نہ تھے

ہم نے زنداں کی باغبانی کی
موسمِ گل کے ہم اسیر نہ تھے

پتھر آئے تھے آئینے بن کے
ورنہ ہم اتنے بے ضمیر نہ تھے

اپنا اندازِ زیست ہے پیغام
یہ تماشے تھے ناگزیر نہ تھے

تیسرا باب

اگر انسان اس محفل میں تنہا، پاگل، آوارہ
پریشاں قہقہوں کے درمیاں
خود لڑکھڑاتا ھے تو کیا ھے

جب کوئی شخص اپنی معصومیت کی وجہ سے اپنے ارگرد کے انسانوں سے کچھ ایسی اُمیدیں وابستہ کرلیتا ہے جن کو ایک انتہائی مادّہ پرست اور خود غرض دنیا بے جا سمجھتی ہے اور اسے بے دردی سے ٹھکراتی ہے تو وہ اس ماحول میں پاگلوں کی طرح لڑکھڑانے لگتا ہے کیوں کہ یہ دنیا معصوم اور سادہ دل انسانوں کی جگہ نہیں ہے۔

مہرِ دانش

مہرِ دانش کی یہ روشنی، زندگی کے اندھیرے
یہ میدان، یہ خون، یہ لاش پہ لاش
گھمسان کی جنگ
کوئی کھڑا مرثیہ لکھ رہا ہے
کوئی رزمیہ لکھ رہا ہے
میں حیران ہوں، کیا لکھوں؟
کیا لکھوں؟

سورج

خلا کے اس روشن آنگن میں
پاگل دھرتی ناچ رہی ہے
خون ملی مٹّی کی راہیں
چلتے راہی، بوجھل پاؤں
سرخ فضائیں، جلتے بادل، شام کی آمد
پیلی دھوپ
آج کا سورج
اپنی ہی کرنوں کے دھویں میں
اپنا چہرہ گھول رہا ہے

کہاں جا رہا ہوں

زمیں پہلے ایسی کبھی بھی نہ تھی
پاؤں مٹی پہ ہوتے تھے
نظریں افق پر
ہمیں اپنے بارے میں معلوم ہوتا تھا
ہم کون ہیں
اور کیا کر رہے ہیں
کہاں جا رہے ہیں
مگر آج عالم یہ ہے
پاؤں رُکتے نہیں
آنکھ کھُلتی نہیں
اجنبی راستوں پر
میں بڑھتا چلا جا رہا ہوں

بس جنگل میں آزادی ہے

کھیتوں میں جو چاند اُگے ہیں
ان کی کرنیں
دھاگوں کی مانند
ہمارے گرد لپٹتی جاتی ہیں
شہروں میں جو آگ لگی ہے
اسی کی لپٹیں
شعلوں کی مانند لپٹتی جاتی ہیں
بس جنگل میں آزادی ہے

بستی کے کنارے

بانسوں کا یہ جھنڈ
یہ پاگل کوّے
یہ ہنگامہ
اور یہ شام
یہاں بستی کے کنارے
کھیتوں کے دامن میں تو
کوئی اور بھی دنیا بستی ہے
کچھ اندھی جانوں کی دنیا
خاموش ہنگاموں کی دنیا
خاموش ہنگاموں کی دنیا

درمیان

یہ جنگلوں کی شاخ شاخ پر چمکتی

زرد سبز پتیاں

اور ان کی گود میں

یہ ننھے ننھے

ہلکے ہلکے پاؤں

چاندنی میں

بھاگتی، کھیلتی، کودتی

یہ ننھی ننھی جانیں

جیسے موت نے کچھ ان کے کان میں کہا نہ ہو

یہ شہر سے اٹھتی اک گھٹا

دھواں کہ جس میں

خاک اڑ رہی ہے لفظ و معنی کی وہاں

میں درمیان میں کھڑا ہوں

اور سوچتا ہوں

میری زندگی بھی کتنی مختصر ہے

جیسے شام کی

❖

البم

اے خوف ناک جہاں تونے کیا نہیں چھینا
رگوں کا خون، کلیجے کی سانس، دل کی تڑپ
اے خوف ناک جہاں تونے کیا نہیں چھینا
ہوئے وطن سے جدا، گھر سے دُور، ہیں مجبور
ہمارے چاروں طرف اک طویل صحرا ہے
اے خوف ناک جہاں تونے کیا نہیں چھینا
ہمیں بھی یاد ہے ہم بھی کبھی مغنّی تھے
ہماری چوٹ سے تالاب پھوٹ پڑتا تھا
چٹانیں نرم بچھونے کی طرح نازک تھیں
ہمارے ہاتھوں پہ صبحوں کے پھول کھلتے تھے
ہمارے نغموں سے سیلاب پھوٹ پڑتا تھا
ہماری روحیں کبھی پیاس سے نہ مرتی تھیں
یہاں گلوں کے بچھونوں سے آگ اٹھتی ہے
یہاں شراب کے پیالوں میں زہر پیتے ہیں
یہاں پہ کھیل کے میدان میں بھٹکتے ہیں

عذاب گاہ ہے کنبے کا یہ بڑا البم
یہ مسکراتی ہوئی اپنی ہی بڑی تصویر
جو تین سال ہوئے گھر سے لے کے آیا تھا
وہاں پہ خشک سیاہی ہے اور کچھ بھی نہیں
خرید لایا ہوں محبوب کے لیے کیا کیا
مگر میں کس کو دکھاؤں یہاں تو کوئی نہیں

چوتھا باب

یہ پُراسرار چہرے
دھند کے آویزاں پردے
اور ان پردوں کے پیچھے جانے کیا ہے

آج لالچ، بغض، حسد اور عناد کی دھند میں لپٹے چہروں کی شناخت مشکل ہوگئی ہے۔ متفرق قسم کے مکھوٹے پہن کر انسان نما درندے انسانیت کا خون کشید کر رہے ہیں۔

وقت آنے سے اس قدر پہلے

رات کے تین بج چکے ہیں دوست
سارا عالم ہے نیند سے مدہوش
ایک شاعر ہے آپ کا لیکن
وادیٔ فکرِ غم میں خانہ بدوش
اس کو نیند آئے کس طرح آخر
سوچتا ہوں کہ صبح دم اٹھ کر
جاؤں گا سوئے شہر میں جس دم
مجھ سے پوچھیں گے غمزدہ انساں
ہے ہمارے دکھوں کا کچھ درماں
کچھ تو اے شاعرِ عزیز کہو!
کیا بتاؤں گا ان غریبوں کو
زندگی جن کی ایک حسرت ہے
جن کی ہر ایک امید ایک فریب
جن کے سر پر ہیں موت کے سائے
جن کا ہر اک قدم غموں سے نڈھال

ان کے اشکوں کو کون خشک کرے
صرف میں ہی نہیں
یہ ساری قوم
قوم کی آنے والی نسلیں تک
اک نوالہ کی طرح ہیں شاید!
رات کے تین بج چکے ہیں دوست
کچھ بتاؤ تو تم بتا جو سکو
ان سوالات کے جواب ذرا
اٹھ رہے ہیں جو ذہن میں میرے
وقت آنے سے اس قدر پہلے!!!

1973

❖

سازش

روشنی چھپا رکھو
رہزنوں کی سازش ہے
اس لہو کے قطرے کو
جو بہت چمکتا ہے
لوگ داغ کہتے ہیں
زخم کو چھپا رکھو

ہاتھ ہاتھ میں ڈالے
کارواں گزرتے ہیں
شہر میں نقابوں کے
جب نقاب اٹھتے ہیں
دوستوں کے چہرے سے
اجنبی ابھرتے ہیں

1977

❖

صبح سے شام تک

صبح سے شام تک، اک عجب سلسلہ

لڑکیاں، میز، کرسی، کتابیں

تھکن، مسکراہٹ

دھڑکتے ہوئے دل اداسی

سرِ شام

پھر میں اسی گرد میں

اب دھنسا جا رہا ہوں

1977

موٹا پردہ

شہر میں رہ کر
شہر سے کتنا دور ہوں میں
محفوظ ہوں میں
ان کیڑوں سے
جو سڑکوں کے گندے نالوں میں
بیٹھے رہتے ہیں

کیونکہ میرے گھر میں
مچھر دانی ہے
کمرے کی دیواریں ہیں
اور باہر دوری کا اک موٹا پردہ ہے

1978

مجھے کہیں اور جانے دو

میں تمہارا دشمن ہوں
میں تمہارے جسم کا جرثومہ ہوں
لیکن تمہاری موت آچکی ہے
اور میں زندہ رہنا چاہتا ہوں
میں اپنے خونریز پنجوں سے
تمہارے چمڑے کو کاٹ دوں گا
میں پھر نکلوں گا
میں خون ہوں
اور خون کو موت نہیں آتی
قانون کی رسیّوں سے
تم نے جو جھولا تیار کیا ہے
اس کے بوسیدہ ہونے پر
تمہیں گھبراہٹ ہے
لیکن میں صرف اتنا چاہتا ہوں
کہ مجھے کہیں اور جانے دو

میری زندگی تم سے الگ ہے
میں نکلنا چاہتا ہوں

خوبصورت دُکانوں میں قیمتی سامان ہیں
اور قیمتی سامانوں میں میری زندگی ہے
اور میری زندگی مجھ سے دُور ہے
مجھے اس کے قریب جانے دو
میری روح ان چیزوں میں ہے
اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں
مجھے کب تک خواب دیکھنا پڑے گا
مجھے خوابوں کو اپنے ہاتھوں میں لینے دو
میری آواز بہت مدّھم ہے
اور اینٹوں کو سرخ گرد بن کر جھڑتے ہوئے تم نے دیکھا ہوگا
وقت آواز ہی کا دوسرا نام ہے
اور میری آنکھ مدّھم نہیں، بہت تیز ہے

میں آہستہ رَو ہوں
لیکن ....
قدیم پتھروں کی کہانی پڑھو
ناچنا بھول جاؤ گے

صرف جھومنے میں عجیب کیفیت ہے
یہ آدمی کو بہت اندر لے کر چلی جاتی ہے
اور پھر ہواؤں کی آواز
چیزوں کے لیے وقت بن جاتی ہے
کہ وقت ہر چیز کے بدلنے کا نام ہے
بچوں کی طرح شور مت مچاؤ
مداری والے کو ڈمرو بجانے دو
اور بچوں کو خوش ہونے دو
اور آؤ..........
ہم تم میوزیم میں چلیں
وہیں باتیں کریں گے
گزرے وقتوں کی باتیں
آنے والے دور کی باتیں
وہاں خاموشی ہوگی
کہ بھیڑ تو بازاروں میں چلی گئی ہوگی
اس ہولناک سناٹے والی جگہ سے کسی کو کیا دلچسپی ہے
اُس کے سوا، جو چیزوں کے راز جاننا چاہتا ہے
تم میرے ساتھ آؤ
دیکھو...... یہ میوزیم: یہ تاج محل، یہ جامع مسجد
یہ ویشالی

یہ اشوک کا اگم کنواں

یہ بدّھ کا مجسمہ

اور یہ اورنگ زیب کی بُجھتی ہوئی تلوار

اور یہ وہ جہاز

جس سے انگریز بنگال میں اترے تھے

اور یہ ایک انسان کے قدموں کا نشان

کتنا حقیر..........

کتنا چھوٹا..........

اور..........اور..........یہ کہاں کھو گیا ہے

کہیں اور گیا ہوگا................

اُن قدموں نے کسی اور سفر کا راستہ ہموار کیا ہوگا

دھوکہ

تم جھوٹ بولتے ہو

کہ پتھر اور شیشے کے مکانوں میں

تمہیں سکون نہیں ملتا

آخر کیوں

ہم ان شیشے کے مکانوں میں جانا چاہتے ہیں

لیکن جا نہیں سکتے

اور تم ہمارے جھونپڑوں میں آنا پسند نہیں کرتے

پانچواں باب

یقیں کی ڈھول
سر پہ بے یقینی کی تپش

آج کی نسل کے بستے میں بچپن سے ہی یقین کی ایک ایسی کتاب اس کے ماں باپ اور دیگر استادوں نے رکھ دی تھی جسے ضرورت کے وقت جب اُس نے کھولا تو اُسے اس کتاب سے کوئی مدد نہیں ملی اور۔ بے یقینی کی تیز دھوپ میں جل رہی ہے۔

"DARINDA"
By
Paigham Afaqui
First Edition Year, 2001
Pages 160
Price Rs/100
ISBN 81-7886-000-7

for more information about author and his other books
Published by
Imkan International
C-5-S, Delhi Police Apartment,
Mayur Vihar Phase-I
New Delhi-110091
Website: www.paighamafaqui.com

منزل کے نام

کیسے کھینچوں تری تصویر تو گم ہے اب تک
تجھ کو اے جانِ جہاں میں نے تو دیکھا بھی نہیں
جب کبھی ابر شبِ مہ میں اڑا جاتا ہے
آبشاروں سے صدا آتی ہے چھن چھن کے کہیں
یا کبھی شام کی تاریکی میں، تنہائی میں
جب کبھی جلوہ جھلکتا ہے تری یادوں کا
میں سجاتا ہوں خیالوں میں حسیں خواب کوئی
سامنے آتی ہے دو پل کے لیے تُو اے دوست
اور اے پردہ نشیں تیرا جو چلمن ہے حسیں
میں بڑھاتا ہوں قدم اس کو ہٹانے کے لیے
ناگہاں دُور سے آواز کوئی آتی ہے
کانپ جاتا ہے، دھڑکتا ہے میرا شیشۂ دل
اور پھر دھندلی فضاؤں میں تُو کھو جاتی ہے
دیکھتا ہوں جو میں مُڑ کر کہ پسِ پشت ہے کون
یاس کے بحرِ سیہ پوش پہ رقصاں رقصاں
زہر آلود تبسم کی کٹاریں لے کر
کوئی لہراتا ہوا سایہ نظر آتا ہے!

❖

ریت کا صحرا

جب ریت کا صحرا دیکھ کے ڈر جاتا ہے ادیب کا سینہ بھی
وہ لمحے اکثر آتے ہیں
جب ذہن کے سارے پردے اٹکے اٹکے سے رہ جاتے ہیں
جب شور مچاتی شاخِ زباں سے سارے پرندے مَر مَر کے
گر جاتے ہیں
وہ لمحے اکثر آتے ہیں
جب آوازوں کے پنجر
اپنے سوکھے ہاتھ لئے
میرے سر پہ چھا جاتے ہیں
اور میں گھبرا سا جاتا ہوں
اک قبرستان کی تنہائی
اک بے معنی خالی رستہ
اور دو پاؤں کی خالی خالی تھکی سی چاپ
تو اپنے آپ سے بھی ڈر جاتا ہوں
جب ریت کا صحرا دیکھ کے ڈر جاتا ہے قلم کا سینہ بھی
وہ لمحے اکثر آتے ہیں

❖

تجربہ گاہ

لٹکتی ہوئی ہڈیاں

بھوت

یہ خوف

کیا ہے یہ سب کچھ

میں کیا کیا بناتا چلا جا رہا ہوں؟

کھنڈر

یہ وہی گلیاں ہیں جن کی قبروں میں
میرا بچپن ہڈیوں کی شکل میں بکھرا پڑا ہے
اور میں جو کچھ بھی تھا
وہ گر چکا ہے
ایک کھنڈر بن چکا ہے

چاندنی کی سانولی کرنوں میں گھبرائی ہوئی
ان گنت روحیں
گذشتہ شہروں سے بھاگی ہوئی
اب فساد شہر پہ حیران، ششدر
اپنی قبروں پر
پرندوں کی طرح بیٹھی ہوئی
اور ان کی آنکھیں جیسے
طاق میں
گزرے زمانوں کے دیئے

شہر کے منارے سے

شہر کے منارے سے
میں نے خواب دیکھا تھا
خوابِ محض
ایک خواب

بیس سال پہلے کی بات میں بتا تا ہوں

کارخانوں کے بیچ
مشینوں کے ساتھ
دھول اور گرد میں
میرا دم گھٹ گیا
دُکانوں کی چمک دمک
عمارتوں کی بلندیاں
گاڑیوں کی لمبی لمبی بھاگتی ہوئی قطاریں
اور ان سڑکوں پہ ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کے

جوڑے ہوئے پنجر

چلتے پھرتے، چُر مُراتے ہوئے

گرتے پڑتے جاتے ہوئے

سڑک کے کنارے

گندے فٹ پاتھ پہ

گرد سے اٹے ہوئے چہرے، پھڑکتی ہوئی آنکھیں

کمزور جسم، سوکھی ہوئی چھاتیاں

مرتے ہوئے بچے

شہر میں رہتے رہتے میرا دم گھُٹ گیا

شہر کے منارے سے

میں نے دور تک دیکھا

پیڑ جیسے جلتے تھے، گاؤں جیسے مرگھٹ تھے

ہر طرف تھا سناٹا

اور.........

میرا دم گھٹ گیا

چھوڑ کر زمانہ یہ

بیٹھ کر بہت پیچھے

ایک سلسلہ پایا

سبز سبز گاؤں کا

سرخ سرخ پھولوں کا

علم کے سمندر کا

شہر سے نکل بھاگا

گاؤں جیسے کھنڈر تھے

کھیت جیسے بنجر تھے

پیڑ جیسے لاشیں تھیں

سڑکیں جیسے آنتیں تھیں

ٹوٹا پھوٹا منظر تھا

میں نے سنا تھا میری آتما گاؤں میں رہتی ہے

مرگھٹ جیسے گاؤں میں

پھرنے لگا میں آوارہ

مجھ کو جیسے یاد آیا

ایک دن بہت پہلے

گاؤں پر مصیبت تھی

اجنبی ممالک کے

گھوڑے آ کے چرتے تھے

سبز سبز کھیتوں کو

اور ہم ڈرے سہمے
اپنے گھر میں رہتے تھے
اور بھوکے مرتے تھے

سیاہ شب سے گھبرا کر
میں ہُوا تھا بنجارہ
شہر کو میں بھاگا تھا
اور کارخانوں کی
روٹیوں پہ جیتا تھا
مجھ کو یاد ہے تب سے
بھیک مانگتی مٹی
گاؤں کی یہاں آکر
زہر پیتی جاتی تھی
اور اپنے بچوں کے
ساتھ ساتھ وہ خود بھی
بھوکے مرتی جاتی تھی
میں نے سنا تھا میری آتما گاؤں میں رہتی ہے
اور پھر بدیسیوں کے
گھوڑے چر گئے سب کھیت
پھر چلے گئے واپس

پھر صدا کوئی آئی

پھر کسی نے للکارا

ہم سے کوئی کہتا تھا

میں تو اب بھی زندہ ہوں

میں نے سنا تھا میری آتما گاؤں میں رہتی ہے

بیس سال گزرے ہیں

اِس اداس منظر کو

اور آج پھر تنہا

شہر کے مناروں سے

میں نے جھانک کر دیکھا

اک حسین منظر تھا

اک عجیب دنیا تھی

ہر طرف تھی ہریالی

ہر طرف پرندے تھے

دریا جن میں طوفاں تھے

ان کا پانی نہروں میں

دھیمے دھیمے چلتا تھا

کھیتیوں میں ڈھلتا تھا

اک عجیب منظر تھا
شہر کے مناروں سے
میں نے ایسا دیکھا تھا

آج جب میں پہنچا ہوں
پھر انہیں نظاروں میں
دیکھتا ہوں لوگوں میں
جینے کی تمنا ہے
دیکھتا ہوں مٹی ہے
مٹی پر مویشی ہیں
دودھ سے مچلتے تھن
ننھے منّے ہاتھوں میں
دودھ کے کٹورے ہیں
گایوں کی نگاہوں میں
سبز گھاس کے منظر
لوہے کی مشینوں نے
کھیتوں کی غلامی کو
اپنا دھرم سمجھا ہے
روشنی میں بجلی کے
گاؤں جگمگاتے ہیں

ریڈیو کے نغموں سے
کھیت گونج جاتے ہیں
ٹیوب ویل کے پانی سے
پودے لہلہاتے ہیں
اور کھاد، پانی سے
دانے پکتے جاتے ہیں
ہم نے یہ بھی دیکھا تھا
ایک وہ زمانہ تھا
جب یہ کھیت کٹتے تھے
اک اداس منظر سا
کتنے ماہ رہتا تھا
اب خزاں کا وہ موسم
بارہا نہیں آتا
اب تو مسکراہٹ ہے
صرف مسکراہٹ ہے
کھیت لہلہاتے ہیں
کھیت جگمگاتے ہیں
گاؤں گیت گاتے ہیں
اُن کی پاک ہتھیلی میں
بڑے بڑے شہروں نے

ناچ گانے گائے ہیں

آج اس گلستاں میں

پھر بہار آئی ہے

پوکھروں کے پانی میں

کنول مسکراتے ہیں

آج ان کے پتوں پر

پھر نکھار آئی ہے

سوچتے ہیں ہم اکثر

کون تھا جو بنجر تھا

ہم کو کچھ نہ تھا معلوم

مٹی چھوڑ کر خود جو

مارے مارے پھرتے تھے

آج لوٹ آئے ہیں

آج اس کو سمجھا ہے

آج اس کو جانا ہے

آج اس پہ جیتے ہیں

آج اس پہ مرتے ہیں

آج اس کو کھاتے ہیں

آج ہمارے جسموں میں

ہے لہو کا ہنگامہ

آج ہمارے جسموں پر
گوشت پوست
ہوتے ہیں
آج ہمارے بچوں کے
چہرے ٹمٹماتے ہیں
ہونٹ مسکراتے ہیں

میں نے خواب دیکھا تھا

آج میں نے دیکھا ہے
پھر وہاں درندوں نے
بستیاں بسائی ہیں
بچے اب بھی بھوکے ہیں
اور دوا نہیں ملتی
کیوں یہاں اُداسی ہے
خوف کی حکومت ہے
ذہن و فکر کے اوپر
اک دھواں مسلّط ہے
کیوں؟
ہاتھ پاؤں کاہل ہیں

اور دماغ بنجر ہیں

میں نے خواب دیکھا ہے

بے پناہ بے چینی
بے قرار ملبے ہیں
پھول جھڑ گئے لیکن
تخم کلبلاتے ہیں
تخم گیت گاتے ہیں

شہر کے منارے سے
میں نے خواب دیکھا ہے
کھیت لہلہاتے ہیں گاؤں جگمگاتے ہیں

میں نے سنا ہے میری آتما گاؤں میں رہتی ہے

کرائسس

ندّیاں میرے قدموں کے نیچے سے بہتی چلی جا رہی ہیں
پہاڑ میرے گھٹنوں
اور درخت میرے رونگٹوں پر رشک کر رہے ہیں
پھیلی ہوئی زمین پر میں کتنا اونچا ہو گیا ہوں
چاند میرے ماتھے پر ہے
اور سورج ہاتھوں کا کھلونا ہے
خدا میری کھوپڑی کے اندر چمگادڑ کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے
سمندر میرا پاؤں چوم رہے ہیں
اور تہذیبیں تیز و تند ہواؤں کی طرح سنسناہٹ پیدا کر رہی ہیں
کہ میں زمین کو ہاتھ میں لے کر اس طرح اُچھال سکتا ہوں
جیسے بچے گیند اچھالا کرتے ہیں
ہزاروں برس سے میں نے یہی خواب دیکھا تھا کہ میں خدا ہو جاتا
اب مجھے خدا رہنا بھی گوارہ نہیں
لوگوں نے میرے قدموں پہ سر رکھ دیے ہیں
لیکن میرا سر جواب ایک بڑا سا بوجھ بن گیا ہے

اسے میں کہاں رکھوں

جنّت میرے داہنے ہاتھ میں ہے

اور دوزخ بائیں ہاتھ میں

اور سر پر نور کا تاج ہے

فرشتے میرے چاروں طرف ہیں

لیکن اب میں کیا کروں

مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ

اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں

قسمت کے ستارے

دوش پہ جن کی ہے رکھی ہوئی بارِ قسمت

خود وہی تارے گرے جاتے ہیں تاریکی میں

پھر بھٹکتا ہوں اگر میں تو خطا کیا میری

کوئی رہزن، کوئی قاتل، کوئی گُم کردہَ راہ

رہنما خود نہیں اسرارِ جہاں سے آگاہ

چھٹا باب

پتھر کے آئینوں سے ٹکراتے ہوئے خوابوں کے لشکر

بلور کی طرح صاف وشفاف نظر آنے والے اس عہد کا المیہ یہ ہے کہ وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے لہٰذا خوابوں کا لہولہان ہونا یقینی ہے۔

چمگادڑ

میں نے آج رات کے آخری پہر
خواب دیکھا ہے
کہ میری کھوپڑی کے اندر
بہت سارے چمگادڑ
پھڑ پھڑا رہے ہیں

❖

چیلنج

آسمان کی پلکیں
کھا چکی ہیں سورج کو
ایک جھیل گہرا سا
بے پناہ تاریکی
جگنوؤں کو پڑھ پڑھ کر
کارواں گزرتے ہیں

اجنبی آسماں کے سائے میں

ٹیڑھی میڑھی سی رہ گزر ہے مگر
آؤ کچھ دور اور ساتھ آؤ
پھر ملے یا ملے نہ یہ موقع
آج ہر چیز دیکھتی جاؤ

وہ جو اک جھیل دیکھتی ہو تم
کس قدر میں وہاں پہ رویا تھا
اپنے ہاتھوں پہ رکھ کے سر اپنا
رات بھر پتھروں پہ سویا تھا

بعد صدیوں کے اب ملی ہو تم
آؤ سب کچھ تمہیں دکھلاؤں
اور پوچھوں کہ اس جگہ سے اب
تم بتاؤ کہ میں کہاں جاؤں

ہر طرف بتیاں اداس ہیں کیوں
اور یہاں کیوں کوئی چراغ نہیں
کیا یہ سچ ہے سدا بہار ہو جو
کوئی دنیا میں ایسا باغ نہیں

حادثہ شہر میں ہوا جو کل
کچھ نہ کچھ تم نے بھی سنا ہوگا
اور جب شہر کا یہ عالم ہے
کون جانے کہ میرا کیا ہوگا

آج ہم تم کھڑے ہیں پُل پہ مگر
چڑھتے دریا کا کیا ٹھکانہ ہے
وقت کے بیکراں سمندر میں
ہر سفینے کو ڈوب جانا ہے

آؤ بانہوں میں میری آجاؤ
چلتے چلتے تو تھک گیا ہوں میں
آؤ آجاؤ کہ تمہارے لیے
کھویا کھویا بہت رہا ہوں میں

کس قدر تم نے یاد مجھ کو کیا
قطرہ قطرہ یہ اب بتاؤ تم
آؤ اس جھیل کے کنارے تک
آؤ چپکے سے بیٹھ جاؤ تم

کس قدر خوابناک ہے دنیا
تم کو اس وقت یہ پتا بھی نہ تھا
اس قدر پیار تم کو تھا مجھ سے
تم نے لیکن کبھی کہا بھی نہ تھا

یہ سفر تھا عجیب ختم ہوا
اب تو یادوں کے پار کچھ بھی نہیں
کتنا فرسودہ ہوگیا ماضی
وہ خزاں وہ بہار کچھ بھی نہیں

ستاروں کی آواز

چلتے چلتے مری نیند ٹوٹی تو دیکھا
ہر اک سمت تاریک اسرار
پتھر کی مانند
رستے کی دیوار تھے
پھر ستاروں نے پیغامِ رفعت دیا
اور خوابوں کے جھونکے
میرے ذہنِ معصوم میں لہلہانے لگے
میرے پر پھڑ پھڑانے لگے
پھر بھی پرواز کے واسطے میں نے جنبش جو کی
میں نے دیکھا کہ بیچارگی
میرے قدموں کی زنجیر بننے لگی
میں فقط ایک بے بال و پر
تنگ و تاریک غاروں کا انسان تھا
پھر ستاروں نے آواز دی

یہ ستارے جو انساں کی آواز ہیں

یہ ستارے جو انسان کی روحِ پرواز ہیں

ان کی آواز پر میں نے جنبش جو کی

میری زنجیر ٹوٹی

میرے دیوتا مجھ سے سہمے ہوئے

مجھ سے کچھ دور پر دست بستہ کھڑے تھے

میں آگے بڑھا

میری یلغار سے بحر و دشت و جبل زر اگلنے لگے

میں بہت خوش ہوا

اور اس زر سے اک آسماں تک پہنچنے کی سیڑھی بنانے لگا

ایک زرّیں چمکتا ہوا زینۂ آسمانی

اور آگے بڑھا

اب میرے ہاتھ دھرتی سے اوپر فضاؤں میں لہرا رہے تھے

مگر وہ ستارے بہت دور تھے میرا زینہ بہت مختصر تھا

تو پھر

میں نے انکار کے پر لگا کر جو پرواز کی

میرا زینہ ہی مجھ سے الجھنے لگا

اور غاروں کے وہ دیوتا

طنز سے مسکرانے لگے

پھر ستاروں نے آواز دی

اپنے ہاتھوں سے خود اپنے زینے کو نیچے گرا کر بڑھا

میں فضا میں اڑا

اور وہ وقت بھی آ گیا

جب حدودِ ہوا

میری پرواز کی راہ میں ایک دیوار سی بن گئی

دیوتا مسکرانے لگے

پھر ستاروں نے آواز دی

میری ہمت بڑھی

اپنے خوابوں کی دنیا سمیٹے ہوئے

میں بڑے عزم کے ساتھ دھرتی پر اترا

خلاؤں میں پرواز کی............

آج پہلا قدم چاند پر ہے............ مگر

ہیں ستارے ابھی دور تاریکیوں میں کہیں جلوہ گر

ان کی آواز گیتوں کے سرگم میں بھرلی مگر

اب وہی میرے پاؤں کی زنجیر ہیں

ایک ضدی سی زنجیر ہیں

دیوتاؤں نے جس کو بنایا مجھے روکنے کے لیے

اور ستاروں نے آواز دی ہے سدا

میرے خوابوں کا لشکر امیدوں کا سورج لیے

میرے گیتوں کی دنیا میں نغموں کے بادل

پراڑنے لگا

اور یہ بادل چمکنے لگے کہکشاں کی طرح

اور اب دیوتا

تنگ وتاریک غاروں میں خودکو چھپانے لگے

وحشی

میں انقلاب کی نہیں انقلاب سے واپسی کی بات کر رہا ہوں
میں ان کے اٹھے ہوئے ہاتھوں
اور دھنسے ہوئے پیٹوں کی طرف اشارہ نہیں کرتا
میرے نزدیک، ان کے میلے دانت
اور بڑھے ہوئے ناخن
زیادہ اہم بنتے جا رہے ہیں

غزل

اندھی راہوں کی الجھن میں بیچاری گھبرائی رات
پہلے لہو میں، پھر آنسو میں، پھر کرنوں میں نہائی رات

اک پردے کو اٹھ جانا تھا اک چہرے کو آنا تھا
کتنی حسیں تھی، کتنی دلکش، شرمائی، شرمائی رات

ہر شاخِ گل میں تھی یہ نرمی، غنچے تک گر جاتے تھے
آج ہر اک ٹہنی پتھر ہے، کیسی آندھی لائی رات

ایک کرشمہ اک دھوکا تھا ایک تحیّر سازی تھی
لیکن اک عالم نے یہ سمجھا کہ دن سے ٹکرائی رات

ایک نیا در، ایک نیا گھر، ایک نیا ہنگامہ ہے
ایک نئے رہزن کے گھر اک نیا مسافر لائی رات

غــزل

پھیلی ہے یہاں بوئے خدا سی کچھ کچھ
ہر سانس پہ جلتی ہے دعا سی کچھ کچھ

مٹتے ہوئے چہرے، یہ دُھندلکے، یہ غبار
سازش میں ہے اک تیز ہوا سی کچھ کچھ

خوابوں کے دریچے، یہ شبِ مہہ، یہ لہو
آئی ہے مرے گھر پہ بلا سی کچھ کچھ

پتھر پہ کوئی پھول کھلا ہے گویا
ہے عارضِ فطرت پہ حیا سی کچھ کچھ

پیغام اندھیروں میں تڑپ کتنی ہے
شمعوں پہ چمکتی ہے ضیا سی کچھ کچھ

ساتواں باب

اگر اس شہر میں
ایک آدمی گھبرا کے مرجاتا ہے
تو کیا ہے

اب ایسے آسمان کے نیچے جہاں انسانیت، رواداری، دوستی، خلوص، ایمان، مذہب سب عنقا ہوگئے ہوں کسی انسان کا گھبرا کر مرجانا عین فطری ہے۔

یہ اندھی رفتار

یہ اندھی رفتار اور اس میں
بھاگتی سڑکیں، چلتے پاؤں
الجھی الجھی لمبی آنکھیں
پتھر کے بے جان سے کان
کتنی تیز ہوا ہے جس میں

سناٹا ہے
کچھ بھی نہیں ہے
ایک ترنم
ایک ہیولا
ایک سماں
اک سپنا ہے

سیاہ آگ

شہر میں جھلسا ہوا میں
شہر سے مفرور ہو کر
شہر میں لپٹا ہوا، دریاؤں کی کشتی میں جب آگے بڑھا
میں نے دیکھا دامنِ کہسار میں بھی
لالہ و گل کے ہیولے ناچتے تھے
میرا دل جذبات کی کشتی میں جب آگے بڑھا
ابر چمکے، آگ ناچی
برف کی وہ دیویاں سنولا گئیں
اور پھر..........
میں انہیں سڑکوں پہ آج
سوکھے سوکھے زرد پتوں کی طرح
زرد چہرہ، زرد کپڑے، زرد آوازیں لئے
ڈھونڈتا ہوں پھر انہیں رومان پرور وادیوں کو
وہ مری ہی آگ میں جو وادیاں رومان کی مرجھا گئیں

روحِ اذیت خوردہ

زخموں کے انبار، در و دیوار بھی
سونے لگتے ہیں
خوشیوں کے دریا میں اتنی چوٹ لگی
کہ اب اس میں چلتے رہنا دشوار ہوا

سڑکوں پر چلتے پھرتے شاداب سے چہرے سوکھ گئے
وہ موسم جس کو آنا تھا، وہ آ بھی گیا
اور چھا بھی گیا
اشجار کے نیلے گوشوں سے اب زہر سارِ ستار رہتا ہے
گلزار، خزاں کے شعلوں میں ہر لمحہ سلگتا رہتا ہے
اس خواب پریشاں میں کب تک
اس روح اذیّت خوردہ کو، تم قید رکھو گے
چھوڑ بھی دو!
اس روح اذیت خوردہ کو

مجھے رات پسند ہے

سیاہ آنچل
جھول رہے ہیں افق پہ
اور تم
ستاروں کا دوپٹہ
پہاڑیوں پر ڈالے ہوئے
مجھے
یاد آ رہی ہو
تمہاری سانسوں کی آواز
میرے کانوں میں گھلنے
لگی ہے
جی چاہتا ہے کہ
سامنے
کی اٹھی ہوئی
جوان
تنہا

خوابیدہ

پہاڑیوں پر سر رکھ

کر سو جاؤں

اور پھر کبھی نہ جاگوں

کہ مجھے دن کے اجالوں سے نفرت ہے

ایک تاریک رات اور میں

اے میری روح، اے ماہِ تاباں، ٹھہرو ٹھہرو کہاں جا رہے ہو
تم سے روشن ہے دل کا گلستاں، ٹھہرو ٹھہرو کہاں جا رہے ہو
کتنا غمگیں ہے وقتِ جدائی، ہر خوشی ہو رہی ہے پرائی
دل سے آہوں کا اٹھتا ہے طوفاں، ٹھہرو ٹھہرو کہاں جا رہے ہو
میں ہوں تنہا ہے ظالم زمانہ، کون سنتا ہے غم کا فسانہ
ایک تم ہو تسلی کے ساماں، ٹھہرو ٹھہرو کہاں جا رہے ہو
رات تاریک تر ہو رہی ہے، مٹ رہا ہے ستاروں کا جلوہ
ہو گئے غم کے بادل نمایاں، ٹھہرو ٹھہرو کہاں جا رہے ہو
چھا گئی ہر شجر پہ اداسی، سو گئے آج بلبل کے نغمے
کر کے تم سارے گلشن کو ویراں، ٹھہرو ٹھہرو کہاں جا رہے ہو

آٹھواں باب

وہ دیکھو
ہاں، وہ دیکھو
آئینوں میں غور سے دیکھو
درندہ کوئی بے فکری سے منہ کھولے ہوئے
سنسان سڑکوں پر رواں ہے

ہم ایک ایسے زمانے میں رہ رہے ہیں۔ جس میں افراتفری، لوٹ مار، قتل وغارت گری کرنے کے باوجود انسان سڑکوں پر بے فکری سے گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے ہیں۔

سرخ چینٹیاں

میری کوکھ سے جنم لینے والے جواں سال شہرو
تمہیں پتہ ہے میں کون ہوں؟
تمہاری چمک کا راز کیا ہے
یہ میں جانتی ہوں
کہ میں نے اپنی زبان سے تمہیں غسل دیا ہے
میں بوڑھی طوائف ہوں
میری گندی نالیوں کے گلبلاتے کیڑے
اور ان سے اٹھتی ہوئی بدبو
تم برداشت نہیں کر سکتے
کہ میری رگوں میں سڑے ہوئے خون کے سوا
ہے ہی کیا
تم اب بھی میری گود میں ہو
اور اب بھی میرا دودھ پیتے ہو

میرے عزیز بچّو !

مجھے ڈر ہے کہیں میرے جسم کے زہر سے

تم بیمار نہ ہو جاؤ

میرے پھٹے پرانے آنچل کو نہ دیکھو

کہ سوکھی پتّیاں، گرتے چھپر

سوکھتے ہوئے جسموں کی قطار در قطار

اور دبے دبے پیٹ کی کھائیاں ہی

میری پہچان ہیں

آؤ کہ پھر میرے گوشت میں طوفان اٹھ رہا ہے

میری گندی نالیوں سے نفرت مت کرو

میرے جراثیم سے مت ڈرو

میں تو صرف تمہارے جراثیم کو پرورش دیتی ہوں

آؤ مجھے گلے لگا لو

ورنہ خون کی دیوانگی

میرے دماغ پر چڑھ رہی ہے

میں زہریلی طوائف کی

زہر افشاں بیٹی ہوں

اگر تم میرا زہریلا خون نہیں چوس لوگے

تو میرا یہ سرخ جسم

ٹوٹ جائے گا

اور میں
سرخ اڑنے والی چینٹیوں کے انبار
میں تبدیل ہو کر
تمہارے پورے جسم سے
چمٹ جاؤں گی

❖

ایک باغی کا مرثیہ

اے مرے دوستو!

کیا بتاؤں، کہاں آ گیا ہوں

میں بغاوت کی راہوں پہ چلتا رہا

پھر بھی باغی نہیں بن سکا

پھنس گیا آ کے اک جال میں

زندگی غیر کے ہاتھ میں بیچ دینی پڑی

راز مجھ پر کھُلا کہ میں آزاد پیدا ہوا ہی نہ تھا

جس قدر خواب تھے سبز، سب سو گئے

دشتِ زنداں میں وہ لُٹ گئے کھو گئے

آج میں ہوں مگر سوچ میری گرفتار ہے

اب مرے پاس اک جسم ہے، جان ہے

اور کچھ بھی نہیں

ایک مفلس ہوں اور ہاتھ میں میرے اتنی بھی قوت نہیں

کہ کوئی کام کر لوں

المیہ ہوں سراپا
وہ انسان ہوں، جو ازل سے ابھی تک ہمیشہ ہی بکتا رہا
اور چھینا گیا اور بیچا گیا
اے میرے دوستو کیا بتاؤں، کہاں آ گیا ہوں

کھوئی ہوئی نیند

وہ نیند کیا ہوئی
وہ رات کیا ہوئی
تھکا ہوا ہوں میں
مری نگاہ تھک چکی
میری سانس تھک چکی
اٹا ہوا ہے میرا جسم گرد کے لباس میں
وہ ندیاں کہاں گئیں
جہاں نہاؤں میں

اے جاگتی ہوئی ہواؤ
چیختی ہوئی صداؤ
اے جہانِ کاروبار کے خداؤ
مجھ کو اس قدر نہ تم نچاؤ
چند لمحے بھول کر تمام حادثات کو
سونے دو مجھے

کہ تھک گیا ہوں میں
جو سو سکا نہ میں تو دن کی روشنی میں
ایسی رات آئے گی
جو کبھی نہ جائے گی

سب سے پیچھے دیکھو

یونیورسٹی سے بیکار نکلنے والے نوجوان
تو محض سامنے کی چیز ہیں
اصل منظر تو وہ ماحول ہے
جس سے ڈر کر یہ نوجوان یونیورسٹی میں پناہ لینے آئے تھے
وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تو تھے
جن میں فرار اختیار کرنے کی بھی قوت نہیں تھی
تم کوتاہ نظر کیوں ہو
تم وہاں دیکھو

درندے کی جھلک

میرے جذبات وخیالات، سبھی خواب سہی
ہاں انہیں تیز ہواؤں میں بکھر جانے دو
روح جلتی ہے تو رہتا ہے غموں کا احساس
دل ہے سینے میں تو آنکھوں میں رہیں گے آنسو
دُکھ ہے جیون میں
تو ہونٹوں پہ رہے گی آواز
مجھ کو پاگل کہو، خبطی کہو، دیوانہ کہو
میری آنکھوں کو
رہِ زیست سے بیگانہ کہو
جو حقیقت ہیں تم ان آہوں کو افسانہ کہو
میرے اعمال کو تم لغزشِ رندانہ کہو
اے مرے شہر کے صد سالہ بزرگو! اٹھو
فاتحہ پڑھ کے میرے شہرِ خموشاں پہ ذرا
اپنے بے روح خیالات کی پوجا کرلو
تم سبھی کچھ کرو اے شہر کے ٹھیکیدارو!

اپنے جذبات کے شیشے کو بچانے کے لیے
نوجوانوں کی تمناؤں کو مسمار کرو
ہم جو بولیں
ہمیں احمق کہو، خبطی کہو، دیوانہ کہو
تم ہمیں کچھ کہو
اتنا ہمیں کہہ لینے دو
آج اس شہر نے
اس شہر کے ہر پتھر نے
تم نے، قانون نے، اخلاق نے، ہر وحشی نے
آج ہر زخم کو اک پھول سمجھ رکھا ہے
تم نے ہر فرض کو
اک بھول
سمجھ رکھا ہے
اے خردمند معمّر چہرو!
ہم تو اس سخت وسیہ
آہنی جالی کے پرے
کسی خونخوار درندے کی جھلک
دیکھتے ہیں!!

حصّۂ دوم

پرواز

پرواز کرو ہر پر پرواز سے آگے
رکھنا ہے قدم وقت کی آواز سے آگے

میں اور آئینۂ حیات

عزم

دُنیا جہاں پہ آکے ٹھہرتی رہی سدا
اس انتہا سے آج بڑھا جارہا ہوں میں
کچھ نقشِ پا یہاں بھی مگر پارہا ہوں میں
مجھ کو یقین ہے مری منزل قریب ہے
دل خوش ہے گو کہ زخم بہت کھارہا ہوں میں
پیہم فصیلِ مشکل وغم ڈھارہا ہوں میں
اس گردشِ نظامِ بہار و خزاں سے دور
بڑھتے ہی جاؤ دل کو یہ سمجھارہا ہوں میں
معلوم ہے مجھی کو کہاں جارہا ہوں میں
اِک آئینہ حیات کو دکھلارہا ہوں میں

منزل

اب یہاں کوئی نقش پا بھی نہیں
میں ہوں اور بیکراں یہ تنہائی
اور مری کوئی انتہا بھی نہیں
لوٹ جانے کا راستہ بھی نہیں
رقص میں ہوں مدارامکاں پہ
زیر پا کوئی راستہ بھی نہیں
میں کشش کے قریب ہوں پیغامؔ
آپ اپنا رقیب ہوں پیغامؔ

قلبِ ماہیت

یہ زندگی جو خزاں تھی کل تک
بہار اب دیکھتا ہوں اس میں
خموش تھی کل تلک جو وادی
وہ میرے نغموں سے گونج اٹھی ہے
وہ لوگ جو دیکھتے ہیں مجھ کو
وہ ہنس رہے ہیں میری ادا پر
مگر مری پشت پر ہزاروں
نگاہیں پھر بھی جمی ہوئی ہیں

کتاب قوم

یہ زیست اک کتاب ہے

ورق ورق میں جس کے ہیں

ہزاروں راز دل کشا

چھپے ہوئے

کہ جیسے بحرِ بیکراں میں موتیوں کا آسماں

یہ وہ کتاب ہے
جو کتنی ہی سسکتی خواہشوں کی داستان ہے

یہ وہ چمن ہے جس پہ آج تک خزاں ہے خیمہ زن

ہے شاخ شاخ تشنہ اور فلک پہ داغ داغ سا

غم والم کی بدلیاں ہیں جیسے چوٹوں کے نشاں

اور آستانۂ امید

اداس شام کی طرح خموش ہے
بکھیرے زلف ماتمی

ہے زندگی کھڑی ہوئی امید کے دوار پر
زندگی!
جو غمکدہ بھی ہے
اور پیکرِ امید و عزم بھی
جو پست ہے، ذلیل ہے
اور راستے کے کیڑوں کی طرح پسی ہوئی
جو درد و غم کا ایک پیکرِ نظارہ سوز ہے
ہے جس پہ ہر ستم حلال
ہے جو محوِ اضطراب و پُر ملال
اس کے پاس غمزدوں کے واسطے ہے درد بھی دوا بھی
اور بے خطر زباں پہ گونجتی ہوئی صدائے حق بھی ہے
اسی کے ہاتھ میں چراغِ امن واماں بھی ہے
یہی بلندیوں کی عظمتوں کی رازداں بھی ہے
ہے انگ انگ جس کا زخم سے بھرا ہوا مگر
رگوں میں جس کی انقلاب لے رہا ہے کروٹیں
بلندیاں جہاں کے ذرے ذرے میں ہیں نغمہ زن
ہے جس کی رفعتوں کے دام میں اسیر کہکشاں
بلندیاں اور عظمتیں ہیں جس کی گردِ نقشِ پا
جو عرش و فرش کے حدود سے بہت بلند ہے
کتابِ قوم ہے عدن

ہیں جس میں کتنے ہی صدف چھپے ہوئے
مگر جو بحر بحر چھانتے ہیں
جستجو میں وہ کبھی ادھر نہ آ سکے
انھیں تو کھا گیا ہے وسعتوں کا وہ ہوس
کہ جس نے کر دیا ہے ان کو کج نگاہ
اور ایک نصب العین لے کے وہ کبھی نہ بڑھ سکے
گلوں کی آرزو میں وہ سوئے چمن نہیں گئے
اور ڈھونڈتے ہیں صحرا صحرا دشت دشت گلستاں
اُداس پھول ہوں جہاں
کلی کلی ہو بے زباں
وہ حیف منزلوں سے یوں بھٹک گئے
کہ جیسے گھر لٹا کے اپنا بھیک مانگتے پھریں
مگر ادیبو شاعرو!
سخن کے کھیت میں جو انقلاب لانا ہو
تو آؤ گلستاں کی سمت
اس کو دیکھو
اس کو سینچو
اس کی تخم ریزی میں لہو بہا دو تم
اُسی کی تخم سے بنے گا دشت دشت گلستاں
کبھی تو دیکھو درِ زیست میں بھی ڈوب کر ذرا

یہ کس قدر عمیق ہے

یہ کس قدر شدید ہے

ہے اس میں کوئی موجِ بے کلی

جو رینگتی ہے اس کے سینے پر

مثالِ اژدھا

لہو پکارتا ہے گلستاں کا، آؤ سیرِ گلستاں کرو

جہاں کلی کلی اداس ہے

جہاں کا پھول پھول اضطراب میں ہے غرق

اور مردنی جہاں کی شاخ شاخ پر ہے چھا گئی

جہاں ستم کا وہ دھواں ہے

جیسے زندگی کی شام آ گئی

جہاں ہے قتلِ عام زندگی و آرزو......

جہاں لہو بھی اب اداس اداس جا رہا ہے

جیسے کاروان نامراد جا رہا ہو اپنی منزلوں سے دور

جہاں لہو بھی بے مراد ہے......

ہے جس کی ہر صدائے احتجاج جیسے

اک غریب کی نوا

کراہتے ہوئے دلوں کی یہ پکار تو سنو!

اے شاعران دردمند!

ہے تمہارے سینے میں تو ایک موم جیسا دل

ایک پھول جیسا دل......

ایک درد مند دل......

ایک غمگسار دل

اے میری قوم کے ادیبو شاعرو!

بھٹک رہے ہو تم کہاں

کتابِ قوم کو پڑھو!

کتاب قوم کو لکھو

کتاب قوم کو سناؤ

ہم سنیں گے شوق سے

جو چار داد پر بکے وہ خوش ادا نہیں ہو تم

یہ دوستی یہ دشمنی معیار جس کا خودکشی ہو

تم اسے قبول مت کرو

یہ چار داد اک کھلونا ہے

ہمارے شعرا کو جو ملتی ہے خموش رہنے کے لیے

یہ فرضِ اوّلیں ہے پہلے اپنا گھر سنوار لو

تمہاری قوم اوڑھ کر کفن کو سو گئی ہے کیوں

کفن میں کتنے آرزو کے پھول دفن ہو گئے

کتاب قوم ہے کہ آرزوؤں کا مزار ہے

یہ وہ کتاب جو زندگی کی داستان ہے

یہ بزم ہے، یہ رزم ہے، یہ پھول ہے، کلی ہے
اور کراہتے ہوئے دلوں کی اک پکار ہے
جو کچھ نہ لکھ سکو تو اس پہ کوئی مرثیہ لکھو
کہ ہو تمہارے شعر میں بھی سوز و درد کی خلش
لکھو کتاب وہ جو رہنمائے آدمی بنے
نئی کتاب پھر لکھو!
کتاب وہ لکھو جو انقلاب کی گھڑی بنے
کتاب وہ لکھو جو انقلابِ فرانس نے لکھا
کتاب وہ لکھو جو مارکس کے جنوں نے لکھ دیا
قلم سے رنگ بھر گئے جو زندگی کے گیت میں
کہ جن سے آدمی کے لب کو جرأت صدا ملی
تمہارا نغمہ کیا ہے؟
ایک برق و موج کا جہاں
جو شام کے دھوں دھواں کو کردے صبحِ گُل فشاں
جو رات کی چٹان سے
اگائے آفتاب بار زندگی کا ابرِ بیکراں
جو زندگی کا اک شفاف آئینہ ہو
جس میں دیکھیں اہلِ حسن اپنے چہرے کی چمک دمک
تمہاری یہ کتاب وہ کتاب ہو جو حسن کا شباب ہو
جو اہل علم کے لیے نصاب ہو

یہ وقت کی پکار ہے

یہ رکت کی پکار ہے

یہ یاس کی پکار ہے

یہ پیاس کی پکار ہے

ادب وہ پیڑ جس کو تم لہو سے سینچتے رہے ہو آج تک

یہ کس لیے؟

زمانے کی کڑکتی دھوپ میں

وہاں ٹھہر کے ہم

نہ سوچ پائیں اپنی زندگی کی بات دو گھڑی

ہر ایک راہ رَد ہے ایک راہ پر ہی گامزن

جنون وہ ہے

جس کے آسمان میں خرد کی کہکشاں بھی جھولتی رہے

مگر......!

جنوں وہ کیا؟

ہو جس میں خوف سنگ و خشت کا

جنوں وہ کیا؟

کہ بے خطر جو دار پر نہ چڑھ سکے

ادیب کیا؟

قلم ہو جس کا مصلحت کا یوں غلام

کہ لٹ رہی ہو زندگی

مٹ رہی ہو زندگی

تڑپ رہی ہو زندگی

اور وہ سوچتا رہے

کہ اس کا ترجمان میں بنوں تو کیا کہیں گے لوگ

وہ لوگ

ظلم جن کا شیوہ اور نگاہیں جن کی کج

جو دعویدار امن ہیں

مگر ٹپک رہا ہے جن کی کہنیوں سے امن کا لہو

اور شاعروں ادیبوں کے لیے ہے ان کی داد

جیسے فیل کے دکھانے والے دانت

اے شاعرو! یہ وہ حسینہ ہے

جو کہہ رہی ہے کہ

جو اپنی ماں کو قتل کر کے آؤ تم

تو میری وصل تم کو مل سکے گی

اے شاعر و ادیبو!

آستانۂ زماں سے تم اُٹھو!

یہ سنگِ آستاں تمہاری رہگذر ہے

تم کتابِ قوم کو پڑھو

یہ سوز و ساز ہے

یہ دردوغم ہے

وہ چمن ہے جس میں سوزشِ خزاں بھی ہے

اور خیمہ زن ہے بادِ نو بہار بھی

یہ وہ فضا ہے جس کی وسعتوں کی کوئی حد نہیں

بلندیوں پہ جس کے نور ہے

وہ نور بزمِ آدمی میں

جس سے صبح آئے گی

کتاب قوم کو پڑھو

کتاب قوم کو لکھو

حسین تخیلات سے سجاؤ اس کتاب کو

اسے کتابوں میں بنا دو وہ کتاب

جس سے نوعِ انساں کو ملے فروغِ جاوِداں

اٹھو کہ زندگی کی رزم گاہ دے رہی ہے پھر صدا

خرد کا آئینہ لیے ہوئے جنوں کے جام کو

ہیں حرکتیں بھی کوششیں بھی لیکن اس طرح نڈھال

جیسے پھول پارہ پارہ، جیسے بت ہو ریزہ ریزہ

جیسے مست کے قدم

اے چشم ھائے قوم یعنی شاعرو مفکّرو!

بڑھو سوار ہو کے تم خرد کے اسپ برق زن پہ

اور ہاتھ میں جنوں کی روشنی لیے ہوئے

بڑھو کہ رزم نامۂ حیات کو تمہارا انتظار ہے!!!

زمانہ بیقرار ہے

1971

سقراط سے انحراف

کیا تم نے ان دانشوروں کے بارے میں نہیں سنا
جو جھوٹ بات کہتے ہیں
لیکن انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں
اور جب ان پر آگ برسنے لگتی ہے
تو بھی انہیں اپنے جھوٹے پن کا یقین نہیں ہوتا
سقراط زہر کا پیالہ پی گیا تو لوگ اب تک زہر کا پیالہ
پیتے آ رہے ہیں
لیکن اب میں زہر کا پیالہ نہیں پیوں گا
میں زہر پی کر اپنے آپ کو
دھوکا نہیں دے سکتا
سقراط کی روایت کو میں کیوں مان لوں
وہ فلسفی تھا
اور فلسفی اکثر زہر پی کر
مطمئن ہو لیتے ہیں

میں آئینہ ہوں

میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں آئینہ ہوں
میرے اندر تم جسے دیکھ رہے ہو وہ میں نہیں ہوں
میں عام آدمی ہوں
خدا پہلے پیغمبر بھیجتا ہے
لیکن جب تم پیغمبروں کو جھٹلاتے ہو
تو پھر وہ قہر بھیجتا ہے
کیا تم نے ان لوگوں کے بارے میں نہیں سنا
جنہیں عوام نے تباہ کر دیا

یہ فلک یہ زمیں

سائیکل اور پنکھا
گھڑی، زندگی

ناچنا، ناچنا، ناچنا
ناچ ہی زندگی کی حقیقت
ٹھہرنا یہاں بے وقوفی
تو پھر
ناچ سے کوئی گھبرائے کیوں

تہذیب

میں اس کُہسار کا پرتو ہوں

جس کی عظمتِ رفتہ

نئ صبحوں، نئے ارماں، نئے پھولوں کی کھیتی ہے

کھڑا ہوں آج میں تہذیب کے رنگیں نظاروں میں

مگر افسوس میرے دل کی حیرانی نہیں جاتی

سمجھتا ہوں میں ہر آواز کو ہاں پھر بھی تنہا ہوں

میں بجتا ہوں مگر میری پریشانی نہیں جاتی

اگر مر جاؤں تو پتھر میں سو جائے گی یہ دنیا

اگر زندہ رہوں ماضی میں کھو جائے گی یہ دنیا

شاعری کیوں ہے

سوچتا ہوں کہ زندگی کیوں ہے؟
سوچتا ہوں کہ موت بھی کیوں ہے؟
بجھ چکا جب کہ ہر چراغِ الم
پھر فضاؤں میں روشنی کیوں ہے؟
جب کہ ہمدم نہیں یہاں کوئی
اس اداسی میں دلکشی کیوں ہے
رات، غمناک گیت ہو جیسے
اتنی پر درد تیرگی کیوں ہے؟
کس کی خاطر چھلک گئے آنسو
پیکرِ جاں میں بے کلی کیوں ہے
جب کہ ہر شئے کا ہے کوئی مقصود
سوچتا ہوں کہ شاعری کیوں ہے؟

ہے سرودِ ازل یہاں کوئی
چاند کی روشنی کی صورت جو

غم بھری زندگی کی راتوں میں
نور بن بن کے پھیل جاتا ہے
اور احساس کا یہ پیکر جب
سختیٔ روزگار سے تھک کر
اس کی بانہوں میں آ کے گرتا ہے
لوریاں دے کے روح کو میری
اپنی آغوش میں سلاتا ہے
ماہ و انجم کے اس جہاں سے پرے
درد کا بحرِ بیکراں ہے کوئی
جس کی لہریں چمکتی ہیں شاید
جس کی کرنیں یہاں بھی آتی ہیں
اور پھر میرے دل کی وادی میں
ایک بچھڑے ہوئے جہاں کی یاد
اس طرح نغمہ ریز ہوتی ہے
درد میں ڈوب کر وجود اپنا
چاہتا ہے کہ پھر فنا ہو جائے
اور اس وسعتِ دو عالم کے
ذرہ ذرہ میں نغمہ زن ہو جائے!!!

کوئی تو ہے

رات کے پچھلے پہر پیڑوں کے دھندلے سائے میں
کون یاد آتا ہے اتنا
کون تڑپاتا ہے یوں
کس کے پیچھے بھاگتا ہوں رات کی تنہائی میں
نور کس کا جگمگاتا ہے یہاں ہر گام پر
چاندنی خاموش ہے
دل بھی مرا خاموش ہے
وہ کوئی پتھر کی مورت ہے کہ کوئی پھول ہے
وہ مرے خوابوں کا عنواں
کون ہے، کوئی تو ہے!

بچوں سے.......

شبِ تاریک میں امیدوں کے مرکز تم ہو
قافلہ والوں کو رستہ ہے دکھانا تم کو
آج تاریک ہے دنیا سبھی انسانوں کی
راہ میں تم کوئی قندیل درخشاں کردو
تم سے زینت ہے بہاروں کی گلستانوں کی
ماہِ نو تم نہ ستاروں میں کہیں کھو جانا
تم کو دامن میں بلاتی ہے یہ پستی کی زمیں
تم مگر وسعتِ گردوں پہ درخشاں ہو جاؤ
تم کو پانے کے لیے پھر چلے انساں کا ہجوم
ماہِ نو تم نہ کناروں میں کہیں کھو جانا
ماہِ نو تم نہ ستاروں میں کہیں کھو جانا!!!

اک پیار کا ساگر ہے

کچھ سوچ کے الفت کے پرچم کو اٹھایا ہے
معلوم ہے گو مجھ کو، نفرت گہہ عالم میں
دشوار ہے یوں چلنا!
میں توڑ کے رکھ دوں گا، ہر جال کو راہوں میں
دنیا کو اٹھا لوں گا، میں پیار کی بانہوں میں
اس جذبہ الفت کا، طوفان اٹھا دوں گا
نفرت گہہ عالم میں!
میں شمع محبت کو قربان کروں کیسے، نفرت گہہ عالم پہ

یہ جال فریبوں کے، یہ پردے تصنع کے
ہر پردہ اٹھا دوں گا
ہر دل میں محبت کا اک نور نظر آیا
مجھ کو تو ہر اک دل میں اک طور نظر آیا
نفرت کے نقابوں میں

اک پیار کا ساگر ہے
انسان حقیقت میں، کسی درجہ منور ہے
جو دیکھ رہا ہوں میں، وہ سب کو دکھا دوں گا
ہر دل میں محبت کی اک آگ لگا دوں گا!!!

ایک اچھا انسان کون ہے

وہ جہاں ٹھہر گیا، اک جہاں نکھر گیا

وہ جدھر گزر گیا زندگی کو بھر گیا

ابرِ خوشگوار ہے حسن بے شمار ہے

آرزو کی آنکھ کو جوشِ انتظار ہے

پیکرِ خلوص ہے روشنی ہے رنگ ہے

اس کے حسن و ذوق پر ہر نگاہ دنگ ہے

رازِ عرصۂ دوام اس کا ایک ایک کلام

اس کے دین میں حرام راہِ غم سے انتقام

مثل پھول چن لیا راہ میں جو غم ملے

کہہ رہا ہے وہ سلام تم ملے کہ ہم ملے

اس کا پیکرِ خموش اک جہانِ ولولہ

اس کے دم سے عالمِ آرزو میں زلزلہ

بے نیازِ خُلد و حور بے نیازِ کوہِ طور

اپنی آرزو کا یہ، خود ہے عالمِ ظہور

اس کے عزم کا حساب رکھ سکے گی وہ کتاب

اس کے آسماں میں ہے جو مثلِ آفتاب
ہے جہاں سے بے نیاز، گم جہانِ عشق میں
یہ زمیں و آسماں اس کو کیا فریب دیں
بے نیاز رنگ و بو، محو روئے آرزو
اس کی روزگار ہے پیچ و تابِ جستجو
اس کے مہر دل سے جو نور چھن کے آ گیا
رنگ و نور کی شمعیں چار سُو جلا گیا

فرعون

سنا ہے مصر میں اک دور ایسا آیا تھا
کہ سارے ملک پہ ظلم وستم کا سایہ تھا
ہر ایک سمت صداقت کی بجھ چکی تھی کرن
چمن چمن پہ مسلّط تھا تیرگی کا کفن
کہیں دکھائی نہ دیتی تھی شمع نورِ دوام
بھٹک رہا تھا اندھیرے میں کاروانِ عوام
ترس رہی تھی ہر اک دید روشنی کے لیے
تو کوہِ طور پہ چمکے جمالِ حق کے دیئے
سحر کا ابر بہت دیر تک ٹھہر نہ سکا
مٹی وہ تیرگی ہر سمت چھا گیا جلوہ
جہانِ ظلمت وحسرت میں انقلاب آیا
خدا کا نور اندھیرے میں بے نقاب آیا
ہوئی زمانے میں فرعونیت کی رسوائی
دیارِ مصر میں پھر شمع طور لہرائی
وہی نظام مشیّت ہے کائنات وہی
وہی ہیں شمس وقمر دن وہی ہیں رات وہی

زمانے والو، صداقت کا انتظار کرو
جمالِ طور کو سینے میں استوار کرو
ہے یہ وہ شمع درخشاں نہیں فنا جس کو
بجھا سکی نہ کبھی گردشِ ہوا جس کو
کبھی اتر گئی مظلوم کے سفینہ میں
کہیں ہے جلوہ فشاں اب بھی چشمِ بینا میں
شعاعِ حق کی گرانی کبھی نہیں ہوتی
یہ شئے ہے وہ کہ پرانی کبھی نہیں ہوتی

نیا جہاں

میں اس جہاں کی تلاش میں ہوں

یہ ہم نشیں پوچھتے ہیں مجھ سے

بتاؤ کس کی تلاش میں ہو

میں کیا بتاؤں، میں کیا بتاؤں

ہے اک جہاں کی تلاش مجھ کو

ہے اک چمن کی تلاش مجھ کو

جہاں کی ہر شئے سے اک نئی زندگی کا نغمہ ابل رہا ہو

جہاں کی ہر اک کلی انوکھی

جہاں کی ہر شاخ مختلف ہو

میں اس جہاں کی تلاش میں ہوں

نیا جہاں

جس کے ذرّے ذرّے سے ہوگی تخلیق ماہ و انجم

چمن نیا، انجمن نیا، آسماں نیا اور زمیں نئی ہو

نئے حوادث، نئے مقاصد، نئے سمندر، نئی ہوائیں

نئے مسافر، نئے منازل، نئے خیال اور نئے عزائم

جہاں کا ہر حوصلہ نیا ہو

جہاں کا ہر معرکہ نیا ہو

ہوں زندہ دل تازہ دم سپاہی

جو توڑ دیں اس درندگی کو

اور دیں اذانیں نئے سرے سے

خموش و ویران بستیوں میں

وہ بستیاں

جن میں آدمیت کی روح پیاسی ہے اک صدا کی

میں اُس جہاں کی تلاش میں ہوں

مجھے بھروسہ ہے لوگوں پر

لوگ کہتے ہیں کہ یہ انسان وحشی ہیں مگر
کتنے اچھے لوگ ہیں دنیا میں حیرت ہے مجھے
پیار کا ساگر تھا، ہر انساں ملا جو بھی مجھے
آہ! یہ انساں کا دل کتنا عظیم الشان ہے
یہ فرشتوں کے لیے بھی رشک کا سامان ہے
جب لگی ہے چوٹ مجھ کو آنکھیں ان کی بھر گئیں
درد کی خوشبو سے سب کلیاں چمن کی بھر گئیں
ایک رشتہ پیار کا قائم ہے انسانوں کے بیچ
ایک مذہب ہے ازل سے ان کے سینے میں نہاں
ایسا لگتا ہے کہ ہیں سارے جہاں کے لوگ ایک
ابنِ آدم ہیں گناہوں سے تو ہے بچنا محال
پر اندھیروں میں بھی روشن رہتا ہے ان کا جمال
ہر گنہ کرتے ہیں لیکن پھر بھی ہے دل میں خیال
کاش اپنی زندگی سے ہر بُرائی دور ہو
کاش اپنی زندگی پاکیزگی کا طُور ہو
جیسے ان کے دل میں ہے روشن کوئی شمع نہاں
جیسے ہے انساں کا دل صبحِ بہارِ جاوداں

کتنے اچھے لوگ ہیں دنیا میں حیرت ہے مجھے
ڈوب کر تاریکیوں میں پھر ابھر آتے ہیں یہ
غلطیوں پہ اپنی ، اپنے آپ ڈر جاتے ہیں یہ
روتے ہیں آنکھوں میں خونی اشک بھر لاتے ہیں
پیار ہے ان سے مجھے یہ کتنے اچھے لوگ ہیں
ان کے کانٹوں کی چبھن میں بھی مجھے لذّت ملی
درمیاں ان کے مجھے آ کر بڑی راحت ملی
ہیں یہ گُلبن جن سے مجھ کو خوشبوئے الفت ملی
جب میں بچّہ تھا تو مجھ سے پیار کرتے تھے یہ لوگ
ایک آغوشِ محبت تھا جہاں میرے لیے

روح افزا ہے بہارِ سبزۂ انسانیت
کشمکش سے تنگ، یہ آپس میں ٹکراتے تو ہیں
کیا کریں انسان ہیں مجبور ہو جاتے تو ہیں
پر یہ بچوں کی طرح پھر بھول بھی جاتے تو ہیں
ان کی فطرت نیک ہے، ان کی طبیعت خوشگوار
ہیں زمیں پر جلوہ زن یہ لوگ مانندِ بہار

آوارہ بادل

میں تنہا آوارہ بادل
میری بلندی میری قسمت
میں تنہائی میں کٹ کٹ کر
اکثر یونہی بکھر جاتا ہوں

مجھ کو کوئی کبھی نہ سمجھے
میں ہوں ہواؤں کا اک جھونکا
میں ہوں بھٹکتا ایک غبارہ
میں آزادی کا متلاشی
سب سے کٹ کر رہتا ہوں
ٹکڑے ٹکڑے بوند بوند
پانی میں بٹ کر رہتاہوں

میں یاد کیا جاؤں گا

پکارا ہے تجھ کو یہاں آ کے اکثر
خبر یہ سنائیں گے تجھ کو نظارے

یہ کہسار یہ لالہ زار اور یہ وادی

یہ چشمے یہ دریا، یہ ویرانیاں
بھٹکتی پھریں گی پریشانیاں

یہاں اور وہاں گنگناتی ہوئی
اگر تم کبھی اس جگہ آؤ گی

اور سوچو گی

میں کس طرح ان نظاروں میں بھٹکا کبھی
تو گلِ تر کی مانند ہو جاؤ گی آنسوؤں سے

مگر دیکھ کر یہ

یہ سبزے یہ پودے
سجا لیں گے ان آنسوؤں کو گلابوں کے ہونٹوں پہ
جیسے کوئی شعر لکھتا ہے کاغذ کے پتّوں کے اوپر
کہ یہ سب بہت پیار کرتے ہیں مجھ سے

بھوک

آدمی دہر میں جیتا نہیں روٹی کے لیے
لیکن اس شئے کے بنا آدمی مرجاتا ہے
کتنے بچے ہیں کہ بس چاٹ کے سوکھی چھاتی
ماں کی آغوش میں سوجاتے ہیں سینہ مَل کر
اوروہ رات، کے فردوس ہے کتنوں کے لیے
ماں پہ چھاجاتی ہے اک سایۂ وحشت بن کر
ناچنے لگتے ہیں پھر بھوت کی صورت شعلے
اوراس لب سے نکلتی ہے دُعا کہ یارب!
ہیں کہاں تیرے خلیل[1] اور کلیم[2] اور حسین[3]
چاہے یہ نور کا طوفان جہاں سے نکلے
چاہے فولاد کا انسان جہاں سے نکلے

---

[1] نمرود کے ظلم کو مسمار کیا۔

[2] فرعون کے شہنشاہی بربریت کو مسمار کیا۔

[3] یزید کی خودغرضی کی مخالفت کی۔

حصّۂ سوم

بزمِ اشعار

زندگی

یہ حقیقت بھی ہے اور اک خواب بھی
کہ یقیں کا امتحاں ہے زندگی
ہاں دلِ زندہ یہی ہے رزم گاہ
ہاں دلِ مردہ گماں ہے زندگی

خواب گزیدہ

کاتب کو جو لکھنا تھا وہ بھول چکا لیکن
میں شام کا منظر ہوں میں شب کی سیاہی ہوں
کانٹوں پہ تڑپتا ہے رہ رہ کے وجود اپنا
پھولوں کے تعاقب میں بھٹکا ہوا راہی ہوں

شناسائی

تاریکی میں بھاگ رہے ہیں غم سے یہ دیوانے لوگ
کیا کیا ارماں لے کر آئے تھے کتنے انجانے لوگ
میری زباں جو گنگ ہوئی تو مجھ کو سب نے لوٹ لیا
آنکھوں میں تو دیکھ رہے تھے یہ جانے پہچانے لوگ

کھوٹے لمحے

پتھروں نے بھی اجنبی جانا
یہ نہ پوچھو کہ رو دیا کیسے
زندگی جس کی برف، خون سیاہ
رنگ تصویر کو دیا کیسے
جیسے بادل ہوا میں گھل جائے
میں نے لمحوں کو کھودیا کیسے
زخم فرسودہ اور بدن رُسوا
وقت نے ہم کو دھودیا کیسے

مستقبل

غم نہیں ہم کو، غم رہیں نہ رہیں
یہ خدا، یہ صنم رہیں نہ رہیں
آج ہی چھیڑتے ہیں نغمۂ سنگ
کیا پتہ کل کو ہم رہیں نہ رہیں
شاعری رنگ و نور کی اچھی
یہ زباں، یہ قلم رہیں نہ رہیں

عزم

ہوئی نغمہ زن میری زندگی تو خموش موت بھی رہ گئی
میرا عزم دیکھ کے بات کچھ وہ خلاف شان بھی سہہ گئی

پرواز

پرواز کرو ہر پر پرواز سے آگے
رکھنا ہے قدم وقت کی آواز سے آگے

جنونِ باغباں

جنونِ باغباں کی زد میں ہے جب گلستاں سارا
نہ ہو پھر آشیاں پامال اپنا، ایسا کیوں کر ہو

تیری کرنیں

اب کوئی شام نہ آئے گی مِری آنکھوں میں
تیری کرنوں نے جلا ڈالی ہیں پلکیں میری

جوئے شیر

زندگی کی معشوقہ قید خواب گاہوں میں، مانگتی ہے قربانی
آج یہ حقیقت ہے، پہلے اک فسانہ تھا، جوئے شیر کا لانا

بال و پر

ویراں ہے راہ شوق مگر کیا کرے کوئی
دار و رسن پہ جائیں مگر بال و پر کہاں

شعر کہنے کی رات

جوش پر ہیں خیال و دل میرے
شعر کہنے کی رات آئی ہے

حیرت

کتنے طوفان آرہے ہیں دشت سے ویرانوں سے
کتنی حیرت ہے کہ پتہ تک کوئی ہلتا نہیں

سسکیوں کے پر سے اُڑتے ہیں پرند
لڑنے والوں کے مقدر دیکھنا

●

تم سمجھتے ہو کہ یہ ہو جائے گا
کیا مگر ہوتا ہے اکثر دیکھنا

●

اپنے لمبے ہاتھ پر نازاں تو ہو
ان کے ہاتھوں میں ہے خنجر دیکھنا

●

خواب کے پردے میں کیا تصویر ہے
خواب کی تعبیر لے کر دیکھنا

●

آندھیوں کی زد میں آ کر کس طرح
اڑنے لگ جاتے ہیں پتھر دیکھنا

●

جب کبھی آواز گرنے کی سنو
چیخ کے نزدیک جا کر دیکھنا

●

ڈوبنے سے تم کو بچنا ہو اگر
اس پیالے میں سمندر دیکھنا

●

پرواز کرو ہر پر پرواز سے آگے
رکھنا ہے قدم وقت کی آواز سے آگے